اقلیتی برادری کے ساتھ بیتے لمحات

تحریر: انعم باسط

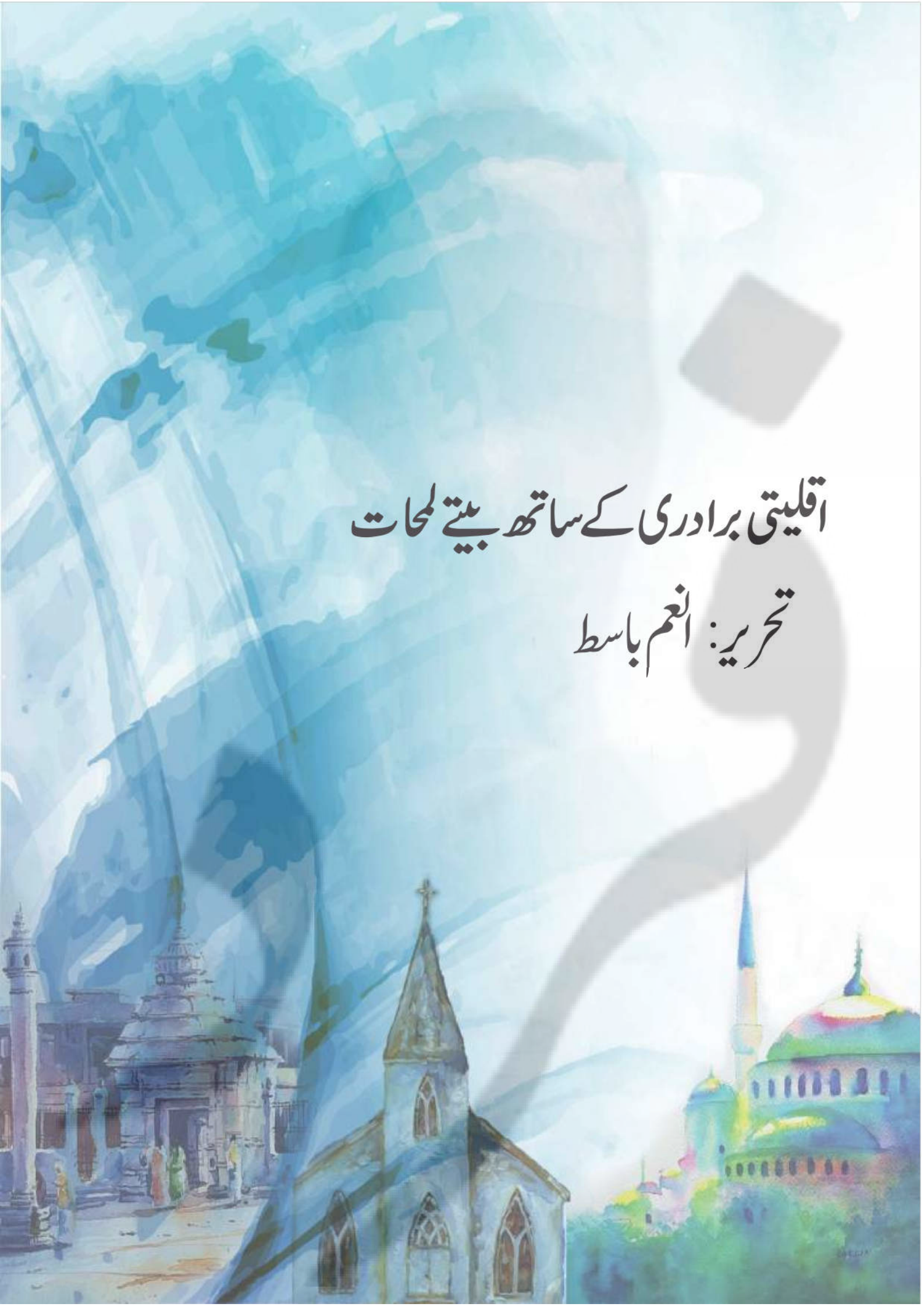

مردان میں پیش آنے والے واقعے نے ہر جانب ایک ہلچل مچادی۔ بلاشبہ نہ ہی ہمارا قانون کسی کو شک کی بنا پر مارنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی قانون کو ہاتھ میں لے کر اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ توہین رسالت کا قانون ایسا قانون ہے جس پر عدلیہ کو جلد از جلد فیصلے سنانے چاہییں۔ جب ایسے کیسز کے فیصلے التوا کا شکار ہوتے ہیں تو لوگوں کو محسوس ہوتا ہے کہ انہیں انصاف نہیں مل رہا اور عدلیہ درست کام نہیں کر رہی۔ اس ملک میں صرف اقلیتی برادری ہی غیر محفوظ نہیں ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بطور ایک شہری کے ہر ایک شخص غیر محفوظ ہوسکتا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ہماری حفاظت کے لیے قوانین موجود نہیں ہیں قوانین کے موجود ہوتے ہوئے یہ کام ہو رہا ہے اور ہم سے ہمارے جینے کا حق بھی چھین لیا جاتا ہے۔ اگر اقلیتی برادری کی بات کریں تو ان کے بارے میں آئے روز آنے والی خبروں سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک شہری ہونے کے ناطے شاید اکثریت سے زیادہ غیر محفوظ ہیں۔ جب پچھلے دنوں مجھے دفتر کے کام کے سلسلے میں لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں میں کچھ نئے لوگوں سے ملی اور اِن سے پاکستان کے مسائل پر بات کر کے ایک منفرد اور مثبت پہلو دیکھنے کا موقع ملا۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ انٹرنیٹ اور اخبارات کی دنیا میں گھومنے سے بہتر ہے کہ ہم لوگوں سے ملیں اور اِن کے تجربات سے سیکھنے کو ترجیح دیں۔ مجھے معلوم ہے کہ پاکستان میں بسنے والی اقلیتوں کو بہت سی مشکلات اور تکالیف کا سامنا ہے اور اگر میں اِن پہ لکھنے بیٹھوں تو شاید اِس عنوان کے لئے صفحات کم پڑ جائیں گے۔ پھر میں نے خود سے سوال کیا کہ ہم ہمیشہ منفی سوچ کی عینک پہن کر ہی کیوں کسی بھی پہلو کو دیکھتے ہیں۔ ہمیں اپنے مسائل سے نمٹنے کے لئے ایک مثبت سوچ کی ضرورت ہے۔ یہی منفرد سوچ لئے خوشگوار موڈ میں ہم دفتر کے ساتھیوں نے کچھ کمیونٹی بیسڈ آرگنائزیشنز کے افراد کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا جہاں مسیحی برادری کے افراد کے ساتھ بات کرنے کا موقع ملا۔

کھانے کی میز پہ موجود تمام لوگوں کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اِن میں سے اقلیت کون ہے اور اکثریت کون ہے۔ اتنے اچھے ماحول میں میرے دماغ میں جتنے سوالات تھے ان کے جواب جاننے کی حسرت مزید بڑھ گئی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے لوگوں سے سوال کیا کہ آپکے خیال میں حکومت اقلیتی برادری کے حقوق کے لئے کیا اقدامات کر رہی ہے؟ اِس پر مس رضیہ نے جواب دیا کہ سب سے خوش آئند بات یہ ہے کہ اب حکومت نے نوکری کا کوٹہ بڑھا کر ۲ فیصد سے ۵ فیصد تک کر دیا ہے۔ پہلے صفائی کے کام کو صرف مسیحی برادری کیلئے رکھا جاتا تھا پر اب یہ سوچ اور عمل بھی تبدیل ہو رہا ہے۔ اُن کا مزید یہ کہنا تھا کہ اگر ہمیں ترقی کی اس دوڑ میں آگے بڑھنا ہے تو اس کے لئے ہمیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ہوگی۔ انہوں نے بتایا کہ اب گورنمنٹ کے اسکولوں کے نصاب میں بھی تبدیلی دیکھی گئی ہے۔ پہلے ہمارے بچے اسکول میں اپنے آپ کو دوسرے بچوں سے الگ اور تنہا محسوس کرتے تھے پر اب اِس صورتحال میں بھی مثبت تبدیلی دیکھی گئی ہے۔ پنجاب حکومت نے ایک اہم اقدام اٹھایا ہے جس کے ذریعے ان طبقات تک تعلیم کی رسائی ممکن بنائی جائے گی جن کے علاقے میں گورنمنٹ اسکول نہ ہوں یا جن کی رسائی تعلیم تک مشکل ہو۔ اس پروگرام کو سراہتے ہوئے مس رضیہ نے یہ بھی بتایا کہ اِس مہم کے تحت وہ خود اپنے گھر میں اقلیتی برادری کے بچوں کے لئے اسکول چلا رہی ہیں جس میں پنجاب گورنمنٹ انہیں مالی معاونت فراہم کر رہی ہے۔ رومیل رائے جو کہ کرسچین میڈیا سروسز اِدارے کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے گورنمنٹ کے مثبت کردار پر بات کرتے ہوئے بتایا کہ حکومت نے ہمیں ملکی سطح پر سینیٹ میں ہمارے نمائندوں کو نشست دی ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ اب اقلیتی برادری کی نشستیں قومی اور صوبائی اسمبلی میں بھی ہیں۔ اب اِن کا کردار یہ ہونا چاہئے کہ اپنی نشست کا جائز استعمال کرتے ہوئے ہمارے لئے بہتری کی راہ ہموار کریں۔ انہوں نے ہندو میرج بل پر بات کرتے ہوئے کہا کہ اِس بل کو پاس کرانے میں سندھ اسمبلی کا بہت عمل دخل ہے۔ ہماری ہندو برادری کے لئے جو کہ پاکستان میں بسنے والی دوسری بڑی اقلیتی برادری ہے، اِن کے لئے ایک خوش آئند خبر ہے۔ اب ہندوؤں کے ساتھ ساتھ سِکھ بھی اپنی شادی پاکستانی قانون کے مطابق رجسٹر کروا سکیں گے۔ اِس طرح کے اقدام زبردستی مسلمان کر کے کی جانے والی شادیوں کی روک تھام کا پیش خیمہ ہیں۔ سندھ وہ صوبہ ہے جس نے سب سے زیادہ ہندو اور سکھ برادری کو اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔ ۲۰۱۱ء کے سیلاب سے سب سے زیادہ صوبہ سندھ کو نقصان پہنچا تھا۔ جس پر صدر ہندو پنچایت نے خود اعتراف کیا تھا کہ گورنمنٹ اور عام عوام سب نے مل کر سیلاب کی تباہ کاری میں ہماری مدد کی ہے۔ ہماری مدد کرنے میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا۔ یہاں تک کہ ہم لوگوں کو غیبی امداد بھی پہنچی جس کے بھیجنے والے کا کوئی پتہ نہ تھا۔

دوسرا بڑا اقدام جو حکومت کی طرف سے لیا گیا اُس میں اقلیتی گھرانوں کو بطور تحائف نقدی دینے کا ہے۔ چاہے ہولی ہو یا کرسمس، دیوالی ہو یا ایسٹر گورنمنٹ کی طرف سے ہر خاندان کو پانچ ہزار روپے نقد دیے جاتے ہیں۔ دوسری ہی جانب اخوت نامی ایک ادارے نے گورنمنٹ کے تعاون سے رواں سال ایسٹر کے موقع پر پچاس ہزار سے لے کر

ایک لاکھ تک کا قرضہ دینے کا اعلان کیا ہے جو کہ کرسمس کے موقع پر بھی دیا جائے گا۔ رومیل صاحب نے یہ بھی بتایا کہ یوحنا آباد کے تکلیف دہ سانحے کے بعد گورنمنٹ نے خود امن پہ کام کرنے والے اداروں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی اپیل کی ہے۔ جس کے تحت کمیونٹی کے تمام پُر اثر افراد کو ایک جگہ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اِن میں علماء حضرات، استاد، مولانا صاحب، اور پادری صاحب کو شامل رکھا جاتا۔ پھر اِن سے معاشرے اور خاص کر کے اِن کے علاقے میں امن قائم کرنے کے طریقہ کار اور اِن کے پُر اثر کردار کو بروئے کار لانے پر بات کی جاتی۔ رومیل صاحب کا کہنا تھا کہ ایسی ملاقات کے ثمر بھی محسوس کیے گئے ہیں کیوں کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر امن کی فضا میں رہنا چاہتے ہیں۔

میرا اگلا سوال یہ تھا کہ کیا واقعی اب ہم کوئی مثبت تبدیلی دیکھ سکتے ہیں؟ کیوں کہ جتنے بھی حقوق کو محفوظ کرنے والے قوانین کیوں نہ بنالیں جب تک معاشرے میں اقلیتوں کے لیے قبولیت کی حِس بیدار نہیں ہوگی تب تک کسی بھی قانون پر مکمل عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اِس بات پر آفتاب صاحب کا نقطۂ نظر بہت اہم تھا۔ آفتاب صاحب کا تعلق گیان فاؤنڈیشن سے ہے۔ اُن کے بقول وہ بھی وقت تھا جب کچھ ہوٹلوں میں اقلیتی برادری کے لیے الگ کھانے کے برتن رکھے جاتے تھے جو کہ اب نہیں ہوتا۔ اُن کے خیال میں معاشرے کی سوچ کو بدلنے میں حکومت اور انسانی حقوق پر کام کرنے والے اِداروں کا بھی بہت عمل دخل ہے۔ جیسے کہ بیشتر سیاسی لیڈروں کا ہندوؤں اور مسیحی برادری کے تہواروں میں شرکت کرنا اور ایسے مواقعوں پر اظہارِ یکجہتی کا پیغام دینا۔ یہ سب اِس بات کی دلیل ہے کہ پاکستان کی حکومت اقلیت کو بھی پاکستانی قوم کا حصہ سمجھتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ میں سمجھتی ہوں قومی ہم آہنگی بڑھانے اور اقلیتی برادری کے حقوق دلانے میں میڈیا کا بھی بہت عمل دخل ہے۔ ٹیلی ویژن پر ایسے ٹاک شوز اور پروگرام چلائے گئے جن میں سب برادریوں کو اکٹھا لایا گیا اور ان کے مسائل کے حل پہ بات کی گئی۔ ایسے پروگرام نشر کیے گئے جن کے ذریعے ہم آہنگی اور ایک ہونے کے پیغام کو عام کیا گیا۔ اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مس نورین نے کہا کہ ہم تہواروں کے ذریعے ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں۔ مس نورین جو کہ کرسچین میڈیا سروسز کے ساتھ منسلک ہیں، چاہتی ہیں کہ اپنا پیس (امن) سینٹر بنائیں جو کہ اقلیتی برادری کے مسائل پر اور ان کو بہتری کی جانب لے کے جانے پر کام کر سکے۔ اِن کے بقول ایسے سینٹر ہر ضلع میں قائم ہونے چاہیں۔ رواں سال ہی پاکستان نیشنل آرٹ کونسل میں بھی ہولی کے تہوار کا انعقاد کیا گیا جس میں قومی ہم آہنگی اور مذہبی امور کے وزیر کے ساتھ ساتھ بیشتر پارلیمنٹ کے اراکین اور ہندو لیڈروں نے شرکت کی تھی۔

معاشرے میں حکومت اور میڈیا کے مثبت اور اہم کردار کے ساتھ ساتھ کسی بھی صورت عدلیہ کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ۲۰۱۴ء میں سابق چیف جسٹس تصدق حسین نے اقلیتی برادری کے حقوق کے تحفظ کے لیے سات شرائط حکومت کے سامنے پیش کی تھیں۔ چیف جسٹس کے مطالبات میں وفاقی سطح پر ایسی حکمتِ عملی بنانے پر بات کی گئی تھی جس کے ذریعے مذہبی رواداری کو فروغ ملے، نصاب کے ذریعے مذہبی ہم آہنگی کو پھیلایا جائے، ۵ فیصد نوکریوں کا کوٹہ اقلیتی برادری کے لیے وقف کیا جائے، سوشل میڈیا پر اشتعال انگیز مواد کے خلاف نوٹس لیا جائے، اقلیتی برادری کے مال و جان کے نقصان پر فوری طور پہ کاروائی کی جائے اور ان کے لیے نیشنل کونسل بنائی جائے۔ اِن پہ کچھ حد تک عمل درآمد بھی دیکھا گیا ہے جس پر میرے ساتھ بیٹھے مہمانوں نے بات بھی کی کہ ان کو اس کے ثمرات مل رہے ہیں۔ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے جو کمیشن بنایا گیا ہے امید ہے وہ اہم کردار ادا کرے گا اور تقریباً ۷۰ سال ہو جانے پر اب انہیں کسی بھی مسئلے کے لیے اور اپنی آواز کو پہنچانے کے لیے کسی کا سہارا نہیں لینا پڑے گا۔ اِن سب سے بات کر کے مجھ میں بھی ایک اُمید جاگی کہ ہاں! اب حکومت کے ساتھ ساتھ ہمارے اندر بھی مل جل کر رہنے کی لگن بڑھ رہی ہے۔ لیکن جب ہم معاشرے میں رویّوں کی تبدیلی کی بات کرتے ہیں تو اس کے لیے طویل وقت درکار ہوتا ہے۔ معاشرے میں بسنے والے لوگوں کے روّیے بننے میں بھی بہت سے عناصر اور وقت درکار ہوتا ہے۔ بلکل اِسی طرح اس میں بہتری لانے کے لیے بھی مسلسل عمل کی ضرورت ہے۔ اِس میں ہمارے ملک کی ثقافت اور فنکار بھی بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ تمام قوم کو بلا امتیاز اکٹھا کرنے کے لیے ہمارے تہوار اور ثقافتی میلوں کا انعقاد بھی بہت ضروری ہے۔ اِن میلوں اور فنکاروں کے فن کے ذریعے ہم امن کا پیغام قوم کو کوچے کوچے تک پہنچا سکتے ہیں۔ اب لوگ دیوالی اور کرسمس کے تہواروں میں بھی شرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو تمام مذاہب ہمیں اکٹھا رہنے کا درس دیتے ہیں۔ کوئی بھی مذہب تفرقے کی بات نہیں کرتا۔ خدا نے جب ہمیں دنیا میں اُتارا تو ہم مسیح، ہندو یا مسلمان نہیں اُترے تھے بلکہ ہمیں انسان پیدا کیا گیا۔ تو ہم انسانیت کے ناطہ کیسے بھول سکتے ہیں جب کہ ہمارا مذہب بھی ہمیں یہی تعلیم دیتا ہے۔

مصنفہ انڈیویجول لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق معلومات کے لئے رابطہ کریں۔
info@individualland.com